"مجھے افسوس ہے کہ میں نے قدرے بدتمیزی کے ساتھ آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیا لیکن آپ میری پوزیشن کو جانتے ہیں۔ مجھے نہ جیتنے والے قبول کرتے ہیں اور نہ ہارنے والے — مجھے احتیاط کرنی پڑتی ہے — میں اپنے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی تاکہ اپنے والد کو ڈینٹسٹ کے پاس لے جا سکوں... ان کے دانت بہت کمزور ہو گئے ہیں — جب میں نے آپ کو دیکھا — ہاں میں نے آپ کو سپاٹ کر لیا تھا آپ فون بوتھ سے ٹیک لگائے بہت دیر سے وہاں کھڑے تھے اور آپ مسکرا رہے تھے — کس وجہ سے؟"

"کوئی وجہ نہ تھی۔"

"اور میں نے آپ کو پہچان لیا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا — اینڈ ہاؤ از مردان؟"

"ہی از فائن —" مشاہد پھر مسکرانے لگا۔

"آئی ایم سوری —" مسز حسین کے مڈل ایجڈ چہرے پر نوجوان لڑکیوں ایسی شرماہٹ آئی۔ "میں یہ سوال پہلے بھی پوچھ چکی ہوں — لیکن مردان مجھے بہت عزیز تھا — بہت شاندار شخص — وہاں جتنے بھی آفیسرز تھے ان سب میں سے حساس اور — بہت ہینڈسم.... اور لاتعلق بھی —"

"لیکن وہ زیادہ دیر لاتعلق نہیں رہا تھا —"

مسز حسین کی سیال آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں کہ تم جانتے ہو — "مجھے وہ دن یاد ہے جب میں لاہور آئی تھی اور آپ — آپ مجھے اپنے موٹر سائیکل پر بٹھا کر چاروں کونوں میں لے گئے تھے۔ مجھے گلبرگ کا فوارہ اور شنگھائی ریستوران بھی یاد ہے جہاں ہم کھانے کے لئے گئے تھے۔"

"اینڈ وہاٹ اباؤٹ ایسٹ پاکستان؟"

"وہائٹ اباؤٹ اِٹ؟" مسز حسین کی بہتی ہوئی آنکھوں میں ایک ناپسندیدگی تھی جو نفرت کے کناروں کو چھوتی تھی "ایسٹ پاکستان از نو مور — تمہاری تاریخ تو اس کا حوالہ بھی نہیں دیتی۔"

"ہاں —" مشاہد میں وہی بے وطنی کی کیفیت پھر در آئی "ہاں — ہم نے اسے نصاب سے خارج کر دیا ہے جیسے کبھی کچھ بھی نہ تھا لیکن — مجھ ایسے بے شمار لوگ ہیں جن کی تن بدن پر یہ حوالہ کھدا ہوا ہے... میرے اور خاص طور پر مردان جیسے بے شمار

— ایک ایک لفظ اور ایک ایک حقیقت کھدی ہوئی ہے۔"

"آپ کی اپنی حقیقت — مغربی پاکستان کی حقیقت —"

"نہیں میں اس مشترکہ جرم کا حصے دار نہیں ہوں — لیکن آپ تو خود حوالہ

"

مسز حسین کے ماتھے پر کروٹیں آئیں لیکن فوراً ہی ان کی جگہ ایک سب کچھ جان نے والی مسکراہٹ آ گئی "مجھے ایک بہت ہی طاقتور کافی کا کپ درکار ہے — جس میں ، آمیزش بھی ہو"

"آئرش کافی؟"

"ہاں — اور وہ بھی بہت زیادہ آئرش —"

آئرش کافی میں کافی کم تھی اور نپولین برانڈی کی شدت اور گرم گہرائی زیادہ۔

"تم کیسے اس — بقول تمہارے مشترکہ جرم کے حصے دار نہیں ہو — کیا تم مغربی پاکستانی نہیں ہو — تم سب تو بری الذمہ ہو گئے — اپنے اپنے کردار ادا کر الگ ہو گئے اور مجھے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا۔ میں بنگالی ہوں لیکن میں نے تمہارا ساتھ — تمہیں پتہ ہے کہ ٹائیگر نیازی ایک مرتبہ آدھی رات کے وقت آموں کی پیٹیاں کر میرے گھر آ گیا تھا — تمہیں پتہ ہے؟"

یہ وقت نہیں تھا پوچھنے کا کہ وہ صرف آپ کے ہاں آموں کی پیٹیاں لے کر ہی ں آتا تھا —

"وہ زکا خان سے بہت بہتر جنرل تھا۔ کم از کم وہ بچر نہیں تھا کیونکہ بچر ہونے کے خاص قسم کے گٹس کی ضرورت ہوتی ہے — اور وہ اُس میں نہیں تھے — اگر ہوتے وہ اتنے اطمینان سے پلٹن میدان میں اپنی بیلٹ اور ریوالور نہ اُتار دیتا — زکا کبھی ایسا نہ کرتا — وہ اب کہاں ہے؟"

"کون؟"

"ٹائیگر —"

"آخری بار جب میں نے اُس کا نام سنا تھا تو وہ ایک سیاسی جماعت میں تھا اور جب ٹی پر آتا تھا تو عوام شیرِ اسلام زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے —"

"میں جانتی ہوں وہ کس چیز کا شیر تھا —"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ اُن کے درمیان حائل ہوا۔

"لیکن ہم ڈنر کے لئے مل سکتے ہیں..." اُس نے کلائی پر بندھی گھڑی
بے اطمینانی سے دیکھا" مجھے ابھی والد کو لے کر "ڈینیٹ کے ہاں جانا ہے —"

"اگر آپ چاہتی ہیں تو —"

"ہاں — اور ڈنر از آن می"

بُرن کا مہنگا ترین ریستوران بھی کاسینو پلازہ میں تھا۔

ایک وسیع اور تھیٹر نما ہال جس میں ایک بہت بڑا گنبد تھا اور اس کے درجہ
فانوسوں تلے سینکڑوں قطعی طور پر بیزار اور کسی بھی خوشگوار اور خوشی کے تاثر کو چھوں
قریب بھی نہ لانے والے لوگ خوراک پر ایک فرض کی ادائیگی کے لئے گویا جھکے ہو
تھے۔

"مجھے پاکستان سے نفرت ہے —" یہ پہلا فقرہ تھا جو مسز حسین نے کرسی پر بیٹھ
ہوئے کہا اور اُس کے مختصر گندمی جسم کے ایک ایک پور میں وہ نفرت نہ صرف دکھائی د
تھی بلکہ ناپسندیدگی کی ایک شدید مہک چھوڑتی تھی... "تم پہلے پاکستانی ہو جس کے ساتھ میں
نے — بنگلہ دیش بننے کے بعد بات کی ہے —"

"مجھے واقعی اس بات پر فخر کرنا چاہیے —" مشاہد کے گلے میں بہت کڑوا ذائقہ
آیا.. یہ کیا کہہ رہی ہے.. میرا حق ہے پاکستان پر — میں اپنے وطن کو کچھ بھی کہہ سکتا
ہوں — لیکن — لیکن — مسز حسین — اسے کیا حق ہے —

"مجھے اور میرے خاوند کو ایکسپلائٹ کیا گیا تھا — تم جانتے ہو کہ ہماری اپائنمنٹ
ہو گئی تھی ایمبیسڈرز کے طور پر — میں اِدھر اور مسٹر حسین اُدھر آسٹریا میں —"

"میں جانتا ہوں —"

"اور بھٹو نے ہماری تقرریاں کینسل کروا دیں — وہ فوارے کے پاس ہوتا تھا"

"اُسے آج ہینگ کر دیا گیا ہے —"

"اور میں بہت خوش ہوں —"

"یہ پوچھنا مناسب ہو گا کہ کیوں؟ — آپ کیوں خوش ہیں —" اسے کیا حق
ہے —

"اُس نے مجھے بے گھر کیا — مشاہد میں اپنے گھر نہیں جا سکتی کبھی بھی — میں ایمبسڈر کے طور پر آئی تھی اور اب اس ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ہوئی جانتا ہے کہ میں کبھی ہر ایکسی لینسی تھی۔ میں اب یہاں مقامی عدالتوں میں سوس یت حاصل کرنے کے لئے منت سماجت کرتی ہوں کیونکہ میں کہیں بھی نہیں جا سکتی — لہ دیش نہ پاکستان۔"

بلیک بیوٹی سکڑ رہی تھی۔ شرنک ہو رہی تھی۔ عمر اُس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ں کی گندمی رنگت میں سنہری ذرّے کم ہو چکے تھے اور سیال آنکھیں جامد ہونے کو

ویٹرس بل لائی تو مسز حسین نے اُس پر ہاتھ رکھ دیا "نہیں — تم میرے مہمان اور بل پر رکھے ہاتھ پر رگیں اور جھرّیاں ابھر رہی تھیں۔

وہ باہر آئے تو کاسینو پلازہ ویرانی کے باعث بہت وسیع اور سرد دکھائی دے رہا تھا۔ ں کی ہوا دکھ اور سردی دیتی تھی۔

"پاکستان واپسی پر — کیا تم مردان کو ملو گے؟"

"وہ میرا بھائی ہے —"

"میں کم از کم تمہیں نہیں بتا سکتی کہ مردان میرے لئے کیا تھا —" مسز حسین کی یں اُوپر اُسے، مشاہد کو بلندی پر دیکھ رہی تھیں کہ وہ چھوٹے قد کی بہت مختصر مگر جامع کی خاتون تھی "اُسے آپ ایک مرتبہ پھر یہ کہہ دیجیے گا کہ کسی ایک رات جنگل میں... ھ دکھائی دیتا ہے، وہ شائبہ بھی ہو سکتا ہے وہ واہمہ بھی ہو سکتا ہے — اور اگر وہ ت تھی تو بھی یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ شائبہ تھا —"

جنگل میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے —

کسی ایک رات —

گمان بھی ہو سکتا ہے —

واہمہ بھی —

کاسینو پلازہ میں چلتی ہوئی مسز حسین چلتی گئی کہ اُسے واپس نہیں آنا تھا — نہ یش میں — نہ پاکستان میں — وہ اب گمان تھی۔

April is The Cruelest Month of Them all.

ستار نقوی کی موت نے بچرز کو ایک عرصے تک بے آرام اور دکھی کیا۔ اُنہ نے اُس کے کھلے مُنہ اور اکڑے ہوئے بدن کو قبول نہیں کیا تھا —

ایک عرصے کی بے آرامی اور دُکھ کے بعد ملیر کی نیم صحرائی کیفیت میں جب بچ کی کاریں مشورہ کرنے کی غرض سے رُکیں تو بہت دُھول اُٹھی اور جب یہ دُھول لاپرو کی آہستگی سے بیٹھ گئی تو پہلی شکل رحمان گل کی دکھائی دی بلکہ پہلی ناک کہنا چاہیے کیونکہ کہیں بھی اگر دھول اُٹھے اور اُس میں رحمان گل ملفوف ہو جائے تو اُس کے بیٹھنے اُس کی ستواں ناک پہلی شے ہو گی جو ظاہر ہو گی۔ "یارا آئی بیک آؤٹ۔ میں بزدل گیا ہوں"

"اوئے کیا بات کرتے ہو ہمارے ڈیئر پٹھان بچر —" صباحت نے اپنا زبانی پٹا چلایا اور لَے میں آ کر سُر میں ہو کر بولی "آپ کیسے بزدل ہو سکتے ہو؟"

"میں ہو گیا ہوں یارا —"

"ہی ہی ہی —" داؤد صرف ہنسا اور اُس نے اپنے چہرے پر سے دُھول پونچھ کے لئے دعا کے بعد کی طرح دونوں ہاتھ ماتھے سے لے کر ٹھوڑی تک پھیرے۔

"اگر رحمان گل بیک آؤٹ کرتا ہے تو میں اپنی سروسز آفر کرتا ہوں...." دانش کی گہری آواز ملیر کی گرمی میں اور صحرائی کیفیت میں جیسے آسمانوں سے اُتر کر اُن تک آئی "آفٹر آل ہم اب تو بیک آؤٹ نہیں کر سکتے۔ دو چار ہاتھ لبِ بام وغیرہ"

کمند علی خان ابھی تک اپنی کار سے باہر نہیں آیا تھا لیکن اب وہ باہر آیا اور لچک ہوا آیا "واہ ہم نازک اندامو کو کراچی کی اس رطوبت بھری گرمی میں یہاں تک لائے اور اب کہتے ہیں کہ ہم بیک آؤٹ کرتے ہین۔ نہ ہم نہیں کرنے دیں گے گل پٹھان — قسم سے ہم اتنی بڑھیا ذات کے تلیر ہیں کہ آپ ہریان ہو جائیں —"

نورالہدیٰ بھی ہمراہ تھی — وہ ہنستی رہی پھر بیزار ہو کر بولی "واپس چلتے ہیں —"

"گُڈ آئیڈیا — " داوٴد بے حد راضی ہوا "اُدھر جا کے اپنے انکل مردان سے عزتی جو خراب کروانی ہے تو ادھر ہی سے پسپا ہو جاتے ہیں — گُڈ آئیڈیا"

"واپس چلیں اظہار؟" رحمان گل نے اب تک چپ ہر ایک کو "میں تمہیں کیا تاہوں" خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے اظہار سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے"

"ہائیں — " کمند علی خان بولے "تمہیں ہی تو اعتراض ہونا چاہئے اے مرد دانا فتح جھنگ — "

"فتح جھنگ نہیں — فتح جنگ "اظہار نے کمال بیزاری سے کہا اور اس بیزاری کوئی دوسرا اُس کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا تھا" تم لوگوں کو اپنے جغرافیے کا بھی علم نہیں۔"

"واقعی تمہیں کوئی اعتراض نہیں اگر ہم سب بچر ز انکل مردان سے وہ درخواست بغیر یہیں سے واپس چلے جائیں... اُن کی بیرک سے دو کلومیٹر ادھر سے ہی لوٹ جائیں رخواست کئے بغیر"

"ہاں — "

"واقعی؟" رحمان گل انتہائی پُر مسرت ہو کر بولا۔

"ہاں — " اظہار نے ناگواری سے اپنی داڑھی پر جمی گرد صاف کی "اگر میرے ت اتنے نامرد ہو گئے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے"

رحمان گل نے اپنے اولین ری ایکشن میں یہ فیصلہ کیا کہ اظہار کا گلا دبا دیا جائے یا پوائنٹ بلینک پانچ دس گولیوں سے ٹھنڈا کر دیا جائے کہ یہ شخص ایک پٹھان کو نامرد رہا ہے لیکن پھر اس نے اس کے بنجر اور انا کے پانیوں سے ہی زندہ رہنے والے مُنحنی کو دیکھا اور یہ فیصلہ مؤخر کر دیا "ہم یارا جان مان قربان کر دیں گے اپنے یار پر — سے زیادہ انکل مردان ہمیں پھانسی پر لٹکا دیں گے ناں — تو لٹکا دیں — آوٴ۔"

اس "آوٴ" کی کال پر تمام بچر ز اُن تینوں کاروں میں ٹڑاپ ٹڑاپ گھُس گئے جن سے وہ ابھی ابھی نمودار ہوئے تھے اور پھر یہ تین کاریں تین بیرکوں کی جانب... گرمی کی کیفیت میں اور سر پر سے گذرتی فلائٹ پی کے نمبر 622 کو در گزر کرتیں، نہ چاہتے بھی دُھول اُڑانے لگیں۔

بیٹ مین بشیر بر آمدے میں صاحب کے بوٹ پالش کر رہا تھا جب اُس نے سوال

اُڑتی دیکھی اور جان گیا کہ اس کے اندر کی ایک نہیں ایک سے زائد کاریں ملفوف ہیں۔

"تم ذرا احتیاط کیا کرو بیٹے —" مردان اپنے گھنے اور سفید ہوتے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا، گرینڈ فادر کلاکس اور کتبوں میں قدم پھُونک پھُونک کر چلتا ہوا... کہہ رہا تھا اور اُس نے مڑ کر دیکھا کہ شوبھا وہاں ہے یا نہیں اور کیا وہ سُن رہی ہے یا نہیں اور شوبھا نے یکدم کہا "میں سُن رہی ہوں بابا —"

"تم اپنی فوکسی کو چیک پوسٹس پر تو روکتی ہو ناں؟"

"رُکنا پڑتا ہے بابا —"

"انہیں کیا کہتی ہو کہ تم کون ہو —"

"صرف کاغذات دکھا دیتی ہوں، کہتی کچھ بھی نہیں ہوں"

"ذرا احتیاط کی ضرورت ہے۔ بے شمار بنگلہ دیشی شہر میں مقیم ہیں، غیر قانونی طور پر، روٹی اور چار پیسے کمانے کی خواہش میں... پولیس انہیں گرفتار کر رہی ہے — ڈیپورٹ کر رہی ہے... مجھے ڈر لگتا ہے کہ کسی روز... اُن سے یہ نہ کہنا کہ تم بنگالی ہو"

"آج تک تو آپ یہی کہتے آئے ہیں کہ..."

"ہاں — لیکن اب نہیں — مجھے ڈر لگتا ہے" مردان نے ایک کتبے کی آرائش کو جھُک کر دیکھا اس پر کچھ دھوپ تھی جو بیرک کے سالخوردہ تختوں کی دَرزوں میں سے آ رہی تھی "اسے جھُک کر دیکھو —"

شوبھا جھُکی —

"ان سپاہیوں کو دیکھ رہی ہو — تلواریں اور شاندار لبادے، پتھر میں سے نکلتے ہوئے۔ سینکڑوں برس مکلی کی کسی قبر پر پہرہ دیتے رہے اور اب یہاں ہیں، بے کار اور بے مصرف، کسی بھی تاریخ کے بغیر — سپاہی کا اختتام اسی طرح ہوتا ہے —"

"آپ کو افسوس ہوتا ہے بابا؟"

"نہیں — میں نے اپنے آپ کو پتھر میں ساکت کر کے کسی قبر پر پہرہ دینے سے روک لیا ہے —"

کرنوں کا زاویہ کچھ ایسا تھا کہ پتھر کے سپاہیوں میں سے صرف ایک کے خدوخال روشن ہو رہے تھے... اُس کی شکل میں مردان کے مہاندرے کی شباہت تھی۔

"میں نے بھی ایک تلوار دیکھی تھی —" مردان جھُکا ہوا اُسے دیکھتا رہا۔ اُس

کو "جیسور میس کے ڈائننگ ہال میں دیوار پر آویزاں ایک شاندار، بھاری اور زنگ تلوار جس کی ایک تاریخ تھی۔ اس کا بیکار لوہا سینکڑوں برس سے خون کا ذائقہ نوش کر چکا تھا — وہ نہیں جانتا تھا کہ جب وہ انسان کے بدن کے اندر جاتا ہے اور دور پہلے وار کے زور پر جاتا ہے تو انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا، وہ چند لمحوں کے لئے بے خبر ہے اور پتہ تب چلتا ہے جب یہ لوہا اُس کے جسم سے کھینچا جاتا ہے — تب خون کی بوند نمودار ہوتی ہے۔"

"بابا" شوبھا نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اُن کے علم میں آگیا وہ اب دور تک جائے گا اور ایسی باتیں کرے گا جو اُس کے علم میں نہیں ہیں... اُن میں جنگل تھا اور کچھ شائبے تھے، کسی ایک رات میں۔ گمان بھی ہو سکتا تھا اور واہمہ بھی بابا اکثر بھٹک جاتے تھے۔

وہ دونوں اُس کتبے پر جھکے رہے جس میں کنول کے پھولوں کے درمیان لمبے ں والے پھرے دار تلواریں سونت کر ساکت ہو چکے تھے۔

"تلوار چلانا بہت آسان ہے —" مردان نے پیچھے مڑ کر اپنی بیٹی کو دیکھا جس کا اُن کے کندھے پر رکھا اُسے سکون دے رہا تھا "لیکن تلوار سہنا کیسا ہے — یہ تو کوئی بتا سکتا —"

جنگل میں لالٹین کی مدھم اور گم ہوتی پھر سے تیرتی واپس آتی روشنی میں — عورت ناکافی ساڑھی میں لپٹی سر جھکائے یوں بیٹھی تھی جیسے ڈرائنگ کے پیریڈ میں علموں کے سامنے ایک ماڈل بے حس و حرکت اپنے آپ کو بمشکل ساکت کئے بیٹھا ہے تاکہ پنسل کا کوئی سٹروک آگے پیچھے نہ ہو جائے —

سب ایک قطار میں بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے — جنگل میں۔

بیٹ مین بشیر بدستور بوٹ پالش کر رہا تھا اور ابھی تک وہ کاریں جو ایک سے زیادہ اور بیرکوں کی طرف آتی دھول اُڑا رہی تھیں — اُس دھول میں پوشیدہ تھیں۔

مردان نے اپنے کندھے پر رکھے اس بہت ہی آرام دینے والے مرہم جیسے ہاتھ جو اٹھا کا تھا اس پر اپنا ہاتھ رکھا "بہرحال تم احتیاط کیا کرو —"

"بابا — وہاٹ اباؤٹ آپا عارفین؟"

وہ دونوں اب بھی یہیں تھیں۔ نازنین اور عارفین — عارفین ہفتے میں ایک بار

ڈیفنس کے ناریل والے گھر میں جاتی۔ کاروں کو دھونے اور پالش کرنے والا شخص ابھی تک لاعلم تھا کہ بیگم بابر فوت ہو چکی ہیں اور اب اس گھر میں کوئی نہیں رہتا۔ وہ اپنے وقتِ مقرر پر آتا۔ صابن پالش اور ٹاکیوں سمیت اور پوری دل جمعی سے کاروں کو وحشی پالش کرتا اور چلا جاتا۔

عارفین صرف اپنے جہیز کا سامان دیکھنے جاتی۔ کارٹنز میں پیک شدہ ڈنر سیٹ، کراکری، ڈیپ فریزر، ساڑھیاں، شاہ طوس کی شالیں — ایرانی قالین — دیکھتی اور پھر ملیر کی بے آرام اور گرم بیرکوں میں واپس آ جاتی۔

"وہاٹ اباؤٹ ہر؟"

"آپ اُن سے شادی کریں گے؟"

اُس کے خوش شکل وقت سے متاثر ہونے والے چہرے نے مڑ کر دیکھا شوبھا کی طرف "میں تو ابھی تمہاری شادی کی فکرمندی میں ہوں —"

اور دُھول میں ملفوف کاریں ظاہر ہوئیں۔ بیرکوں کے سامنے اُن کی بریکیں لگیں اور اُن میں سے تمامتر بچرز برآمد ہوئے، اُنہوں نے حیرت سے اُس ویرانے میں اُس رہائش گاہ کو دیکھا جس میں وہ پہلی بار قدم رنجہ فرما رہے تھے اور جہاں بچرز میں سے ایک — شوبھا رہتی تھی۔

برسوں کا کھایا ہوا لکڑی کا دروازہ کھلا تو بہت ساری روشنی بیرک کے اندر گئی جس سے بہت سارے پتھر، کلاک اور گُل بونے روشن ہو گئے۔ انہوں نے کاروں کے رُکنے کی آواز تو سن لی تھی لیکن مردان نے بھی اور شوبھا نے بھی پہلے ناگواری سے کہ یہ کون خل ہوا ہے اور پھر حیرت سے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

اور پیچھے تمامتر بچرز مجرم بنے کھڑے تھے۔

شوبھا کو یقین نہ آیا۔

"کیسے؟ — تم نے مجھے کیسے تلاش کر لیا؟"

بچرز بہت ہی مجرم محسوس کرتے ہوئے بدستور گُنگ کھڑے رہے۔

"کیسے؟ — رحمان گل — نُور — صباحت یار کیسے؟"

"میں بولوں؟" رحمان گُل نے گویا تمامتر بچرز کی جانب سے اجازت چاہی اور اُن سب نے ایک رضامند خاموشی سے سر ہلائے۔

"سر —" رحمان نے گلا صاف کر کے بیان شروع کیا "انکل مردان سر — ہم
ہاں حاضر ہوئے ہیں تو ایک بہت ہی نیک اور پاکیزہ مقصد کے لئے حاضر ہوئے ہیں —
مگر یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ویسے تو اختیار اُس ذات کا ہے لیکن ہم بندے
ے جو ہیں... تو بس اسی لئے حاضر ہوئے تھے —"

مردان نے انہیں جانچا — بیوقوف سے بچے، ابھی زندگی کے فریب کو نہیں
تے تھے "کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پہلے سب لوگ کچھ کھا پی لو — چائے — کریم کیک یا...
ہاں بیرکوں میں زیادہ چوائس نہیں ہے... اور پھر ہم زندگی اور موت کے بارے میں
کریں —"

مردان کو — شوبھا کو — قطعی طور پر اندازہ نہ تھا کہ اگلا فقرہ رحمان گل کا کیا ہو
اور اگلا فقرہ تھا "اظہار اعوان شوبھا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور ہم — سفارش کرنے
ئے ہیں..."

مردان نے اس ہجوم کو دیکھا جو سفارش کرنے آیا تھا۔

کوئی بھی باپ — کسی قسم کا بھی... بہت لاپرواہ، شرابی، جواری، بہت ساری
وں کا باپ کوئی بھی باپ جب پہلی بار یہ سنتا ہے کہ کوئی اور ہے جو اس کی بیٹی کو لے
ہتا ہے تو وہ سنّاٹے میں آ جاتا ہے۔ اُسے یقین نہیں آتا کہ اس کی بیٹی کو ایک اور
ہ اور ناموزوں سا دکھائی دیتا شخص لے جانا چاہتا ہے، ہمیشہ کے لئے۔ چنانچہ مردان کا
ل بھی یہی تھا "کیا بکواس کر رہے ہو؟"

کٹرز سارے کے سارے جو لاشوں کے بیوپاری تھے جو انسانی بدن کو ادھیڑ کر اُسے
بارہ لگا کر سیتے تھے، جو دل کی شریانوں کو بدل کر راستے بناتے تھے وہ سارے کے سارے
لاہوری محاورے کے مطابق بکری ہو گئے، مکمل طور پر — گُنگ اور بے چارے اور
خاموش ہو گئے۔ اور تب مردان نے صورت حال کو سمجھا اور قدرے نرمی سے ایک
ر کہا "واقعی یہ تم... کیا بکواس کر رہے ہو"

ہر طرف خاموشی تھی۔

کوئی بھی بولنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

تب اظہار اعوان نے بغیر کسی تردّد کے اپنے تمامتر بے پرواہ رویے کے ساتھ
ڑھ کر کہا "سفارش کی کوئی ضرورت نہیں سر۔ میں ایک معزز اور شریف خاندان

سے تعلق رکھتا ہوں جس کے پاس زمین کم ہے اور عزت نفس زیادہ — سر میں کوشش کروں گا کہ شوبھا کو خوش رکھ سکوں۔"

مردان نے فوراً ادھر دیکھا جدھر شوبھا تھی۔ کتبوں اور گرینڈ فادر کلاکس کے درمیان کہیں — کرنوں کی زد میں آنے والے کسی منقش پتھر کے پاس شوبھا تھی — "شوبھا —"

اور اُس نے چونک کر دیکھا جیسے سُندر بن کی پہنائیوں میں اُسے کسی درندے نے آلیا ہو۔

"جی —" اُس نے صرف اتنا کہا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" مردان اب بھی سخت غصے میں تھا اور مخالف تھا کسی بھی ایسے بندوبست کا جس کے نتیجے میں وہ اُس سے جدا ہو سکتا تھا۔

سارے بیچرز دم بخود کھڑے تھے۔

مقدمہ پیش ہو چکا تھا۔

اور اُن سب میں سے زیادہ سکون والا چہرہ اظہار کا تھا — اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔

"مجھے کچھ اندازہ نہ تھا —" بالآخر شوبھا بولی۔

"مجھے بھی نہ تھا —" اظہار نے تیوڑی چڑھا کر کہا۔

"تو پھر۔" مردان نے اُن بیچرز کی موجودگی میں، کلاکس، سنگی تعویزوں اور بیرک میں سٹور شدہ دوسرے سامان کی موجودگی میں شوبھا کی طرف دیکھا۔ شوبھا نے اپنے بابا کو جھجکتے ہوئے دیکھا تو اُن کی آنکھوں کے کنارے بھیگتے تھے اور لگتا تھا کہ وہ سانس بھی آرام سے نہیں لے رہے۔ "مجھے پتہ نہ تھا کہ مجھ پر یہ وقت بھی آئے گا۔"

جن کتبوں پر گھیرے دار لباسوں والے تلوار باز سپاہی ساکت تھے اور بیرک کے تختوں میں سے بچ نکلنے والی زرد دھوپ میں اُن کے چہرے ڈرپوک ہوتے تھے کہ اُن کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور رُکے ہوئے وقت کے آس پاس — دم بخود بیچرز کے گرد اور شوبھا جسے کسی درندے نے آلیا تھا اور مردان جس کی آنکھوں میں پانی بہت تھے — وہاں رطوبت بھری بے چین گرمی میں ناریل کے تیل کی مہک تھی اور پام کے درخت جب تیز ہوا سے جھکتے چلے جاتے ہیں تو اُن کے چیردیں پتوں میں سے جو ہوا بلند سرسراہٹ کے ساتھ نکلتی ہے تو وہ شور اتنا تھا کہ پوری بیرک اس مہک دار سیلاب میں ڈوبنے لگی۔

اس کے بال اس کی پشت پر جھومر ڈالتے بلند ہو ہو کر گرتے تھے جب وہ چلتی
دور ہوتی تھی اور مردان اسی طور — اس لمحۂ موجود کی طرح آنکھوں کے بھیگے
ن میں سے اُسے جاتا دیکھا کرتا تھا۔

باہر ابھی تک بدامنی بہت تھی
لیکن مردان مسز حسین کی شکنجی سے نکل آیا تھا...
اُس شام جب مسز حسین اسلام آباد سے آغاجی کے چارم سے ہپنوٹائز ہو کر لوٹی
اور اپنے بدن پر جو کچھ تھا اُسے بہالے جانے والے پانی کی یاد میں ایسے مسکراتی تھیں
خود بھی ہپنوٹائز ہو گیا تھا — اُس کی آنکھوں کے سامنے جتنے منظر تھے وہ یکسر بدل
جنگ کی لینڈ سکیپ میں جتنے درخت، کھیت اور چہرے تھے اُن کے مفاہیم بدل گئے،
خود اپنے آپ سے ہراساں اور خوفزدہ ہو گیا۔ صرف دو چار روز پیشتر وہ اس
پ کو ایک مختلف نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ان لوگوں کے بدن ایک برسٹ کی آماجگاہ اور
ہاں تک پسلیوں سے ٹکرائے بغیر اندر تک جاتی ہے — اور جنگ ایک مقدس شے
- تو مردان پر منظر بدل جانے والا لمحہ تب آیا جب مسز حسین — باہر کی ہولناکیوں
نود... ایک پورے ملک میں بھوک اور خون کے باوجود کس لاتعلق اطمینان سے،
ے آغاجی کی بھنووں میں جو سیکس اپیل تھی اُس کے بارے میں لجالجا کر بات کرتی
وہ اُس لمحے اُس شکنجے میں سے نکل آیا جس میں اُسے وطن کی مُحبت۔ ڈیوٹی اور
لی زنجیروں سے جکڑا گیا تھا.... اب ایک اور لمحہ آنے کو تھا جب ایک زنگ آلود
لرکوائی سرخی دیتی ہے کہ وہ بقیہ عمر اُس سرخی کو بھول نہ پایا تھا — لیکن اُس لمحے
وہ مسز حسین کا شکر گزار بھی تھا جنھوں نے اُسے ایک ٹریپ سے آزاد کر دیا۔

مولوی احتشام الدین آلتی پالتی مارے چپ چاپ اور بہت دیر تک ہارمونیم کو
زیر اُنگلیاں جمائے بیٹھا رہتا —
اس کا اپنا گھر اس کے بس سے باہر ہو رہا تھا۔ ڈھاکہ میں۔ نواکھلی اور باریسال
اور جیسور میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ کیسے آنکھیں بند کر کے اُس سے لاتعلق ہو سکتا
باغ کو جب آگ نے کھایا ہے اور اُس میں پولیس کے لوگ جلے ہیں تو اُن کی بُو

صرف ڈھاکہ میں تو نہیں پھیلی تھی — یہاں اس جھونپڑے میں بھی تو آئی تھی۔

مولوی احتشام الدین اب بھی اپنے پاکستانی مسلم عقیدے پر قائم تھا لیکن اُسے ہم وطنوں کے جلتے ہوئے جسموں کی بُو بہت پریشان کرتی تھی۔

گاؤں میں لوگ اعتراض کرتے تھے — پاکستانی فوجی — ادھر نہیں آنے کا احتشام الدین... بچرز — ان کو صرف زمین چاہئے۔

مہرالنساء بھی بہت خاموش رہتی تھی — اس کے بالوں میں اُٹھنے والی ناریل کے تیل کی مہک اگرچہ اب بھی مردان کو کچھ عجیب سی لگتی تھی لیکن وہ منتظر اُسی مہک کا رہتا تھا۔

آپ کی جان کو ادھر خطرہ ہے کپتان صاحب — آپ ادھر نہ آیا کرو — تھوڑا دن ٹھہر جاؤ پھر اللہ کو منظور ہو گا تو پھر میل جول ہو گا۔

سبھی تو ٹائیگر نہیں ہوتے کہ مسکراتے ہوئے اطمینان سے اپنے ریفک اُتار کر میز پر رکھ دیں، اپنا ریوالور دوسرے کے ہاتھ میں دے دیں۔ اُن میں سے بہت سارے ایسے بھی تھے جنہوں نے حکم عدولی کی... اپنے آپ کو دشمن کے سامنے بے لباس نہیں کیا اور ایک وحشت اور بے چارگی اور بے بسی کو اپنے اندر کچلتے ہوئے بیرکوں سے نکل کر نامانوس اور دلدلوں کی طرح منتظر جنگلوں کی گھنی موت کے اندر چلے گئے۔

مردان بھی اُن میں سے ایک تھا۔

وہ ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔

وہ بھی ان جنگلوں کے نیم تاریک گُنجلک اور موت منتظر خانوں کے اندر کئی دن تک ایک نیم وحشی جانور کی وحشت سے چلا — دانت نکوسے — غراتا ہوا اور کانٹے دار جھاڑیاں اور سوکھی ٹہنیاں اُس کی وردی کی دھجیاں اُتار اُتار کر اپنی زیبائش کرتی رہیں اور ننگے بدن پر خون کی لکیریں کھنچتی چلی جاتی تھیں — بھوک اور پیاس سے نڈھال لیکن ایک جانور کی طرح وحشت میں گم گرتا پڑتا اور خون آلود ہوتا — کبھی ایک سسکی نکوستے ہوئے دانتوں میں سے جب کوئی زخم مزید گہرا ہو جاتا — داڑھی کے بال تیز نوکیلے بانس کی کونپلوں کی طرح بڑھتے چلے جاتے تھے اور اُن پر پسینے کے قطرے زیادہ دیر ٹھہرتے نہیں تھے، نوکِ خار پر لرزاں شبنم کی طرح... بہ نوکِ خارے رقصم — اُس کے بُوٹوں کا چمڑا گیلا اور بوسیدہ ہو کر اُس کے پاؤں کی جلد سے جُڑ جاتا اور پھر اُسے ادھیڑ کر جنگل میں نکلا

جانا۔
وہاں کوئی راستہ نہ تھا۔
کدھر جانا ہے اس کا بھی کوئی تعین نہ تھا ——
جہاں جہاں جن ڈالیوں اور پتّوں پر اُس کے خون کے دھبے لگتے جاتے تھے اگر اُن
رنگی ہوتی تو یہ جنگل ازل سے ابد تک لَو دینے لگتا۔
ایک نیم تاریک خلا تھا جس میں وہ ایسے چلتا اور بھاگتا جا رہا تھا جیسے ماضی میں واپس
ہو، اُس کا قد مختصر ہو رہا ہو —— درختوں کی چوٹیاں لحظہ بہ لحظہ بلند اور بہت اُوپر ہوتی جا
تھیں۔ زبان مُردہ بُو دیتے بدن کی طرح پھُول رہی تھی اور وہ اُسے بہت دِقّت اور
سے منہ کے اندر دبائے چلتا تھا دانت نکوستا ہوا... اس پر اس عالم میں بہت ساری
نیں وارد ہوئیں۔
گھاس، پھُول بُوٹے، جھاڑیاں، درخت جن کی کوئی شکل کوئی ہیئت نہ تھی سوائے
اور پتّوں کے اور ان کی ایک سُرنگ تھی جس میں وہ تیرتا چلا جاتا تھا —— سمت کے
کے بغیر۔ دن یا رات کے حساب سے الگ۔ موسموں سے ماورا —— تیرتا چلا جاتا تھا
ن کی ہتھیلیوں کے ساتھ کانٹے دار بُوٹے اٹکتے تھے اور بدن پر بھی جھالروں والی
مور چھل کی طرح جھلی جاتی تھیں اور یہ بھی ہوتا تھا کہ اُس کے پاؤں کوئی پانی کا
جکڑ لیتا تھا اور پھر فوراً گرفت ڈھیلی کر دیتا تھا اس زور کی وجہ سے جو مردان کے بدن
ور کرتا تھا جہاں جہاں اسے ٹانکے لگے ہوئے تھے اُن ٹانکوں کو ادھیڑتا تھا۔
جب ہریادل کی سُرنگ اختتام کو پہنچتی تو وہ خلاء میں بے آواز اور آہستگی سے
لگتا۔ صرف اس خلاء کے رنگ سبز اور گہرے سیال تھے —— وہ اس میں ناک اُونچی
ے تیرنے کی کوشش کرتا کہ کہیں وہ اس میں غرق نہ ہو جائے۔ اور کبھی وہ نیچے بھی
اور خلاء کا سیال سبزہ اس کے بدن کے اندر داخل ہو جاتا اور اُسے غوطہ آ جاتا اور وہ
ہوا زور لگاتا اور پھر سے سطح پر آ کر تیرنے لگتا۔
دن اور رات کا کوئی حساب نہ تھا۔
انسان کا بدن جو کچھ —— اور کیا کیا کچھ سہار سکتا ہے اس کا بھی کوئی حساب نہ تھا۔
چوہدری اللہ داد کے باکس کیمرے میں سے تصویریں نمودار ہوئی تھیں، تیز ہوا
ہرے ہوتے درخت اور... اور وہ اُس کے اُوپر دوہرے ہوتے تھے —— ہوبہو وہی

تصویریں — یہیں — یہاں پر — ناریل کے جھومتے دوہرے ہوتے درخت تیز و تند سائیکلونی ہواؤں میں کیسے دوہرے ہوتے ہیں اور اُن سے ٹپ ٹپ ناریل گرتے ہیں، نیچے ریت ہو تو دھنستے ہیں پانی ہو تو ڈوب جاتے ہیں۔ اِن فلک بلندیوں تک جاتے درختوں، ہواؤں میں سنسناتی جھاڑیوں اور اُن کے اندر دن یا رات کے حساب سے الگ پناہ لینے والے درندوں کے آس پاس سے اگر کوئی حیوان نما انسان دانت نکوستا بڑھی ہوئی پیپ آلود داڑھی اور بدن پر تیز خراشیں خون کی لئے بھاگتا ہے ایسے کہ اُس کے پاؤں کے ساتھ پانی کے سانپ لپٹتے ہیں تو وہ درندے بھی ڈر سے دبک جاتے ہیں اور حملہ نہیں کرتے ایسا ہوا اور متعدد بار ہوا کہ مردان نے ان کی آنکھیں شعلہ بار — جلتی ہوئی دیکھیں — اُسے دیکھتی ہوئیں اور اُن میں ڈر تو تھا اور تعظیم بھی تھی۔

وہ درندے بھی جانتے تھے کہ وہ اپنی انا کے لئے بھاگ رہا ہے — اور ٹائیگر نہیں جانتا تھا۔

ہاں اُن کی جلتی ہوئی آنکھیں اس کے بدن کو داغتی تھیں جیسے کسی گھوڑے کو سرخ دہکتے لوہے سے داغتے ہیں۔

چنانچہ سفر کے اختتام پر — اگرچہ ابھی اُس کے گمان میں اختتام نہ تھا لیکن اس کے اختتام پر وہ شمار کر سکتا تھا — اپنے داغ گن کر حساب لگا سکتا تھا کہ کتنی آنکھوں نے اسے دیکھا اور داغا ہے۔

نہ اسے ہوش تھا۔ نہ پرواہ کہ اس فرار کا کونسا دن ہے یا رات ہے — جو بھی زمانہ تھا اس میں کب اُس کے بدن سے اس کی وردی کا آخری چیتھڑا الگ ہو کر گرا — اور وہ آزاد ہو گیا۔

بھاگتا ہوا آزاد، مردان، ہانپتا ہوا، دانت نکوستا ناریل کے جھکے ہوئے درختوں کے اندر ایک تقریباً کبڑا ہو چکا انسان بھاگتا تھا صرف اس لئے کہ اسے کسی سرینڈر کی میز پر نہ بیٹھنا پڑے۔

اس کے بعد جھاڑیوں میں پوشیدہ جلتی آنکھوں والوں نے اسے دیکھا تو اپنا جانا — وہ اُن جیسا ہی ہو چکا تھا سوائے ایک فرق کے — کہ وہ پوشیدہ ہونے کی چاہت کو فراموش کر چکا تھا اور صرف دور ہونا چاہتا تھا۔ صرف چند کلومیٹر ادھر — بارڈر کی قربت میں — جہاں جنگل چھدرا ہوتا ہے اور جہاں اگر اُوپر سے دیکھا جائے تو ایک کبڑا ہو کر

انابدن دریدہ حیوان صاف نظر آ جاتا ہے، پوشیدہ نہیں رہ سکتا وہاں — وہاں انہوں نے ے گھیرے میں لے لیا —

وہ اُس جنگ کا پہلا ہارا ہوا سپاہی تھا جس کی وحشت اور درندگی کو ایک جال ڈال رقابو میں کیا گیا۔

ایک جانور کی طرح پکڑا گیا۔ وہ قابو میں نہ آتا تھا —

پہلے وہ قابو میں نہ آتا تھا۔ اب آیا تو بے بسی سے ایک کونے میں سمٹ گیا۔

اُس آہستہ رو ٹرین کے ایک ڈبے میں جو اُسے بقیہ جنگی قیدیوں کے ہمراہ ہندوستان کے اندر کسی نامعلوم کیمپ میں لے جا رہی تھی وہ اُس کے ایک کونے میں بھی بے بسی سے سمٹ گیا۔

کیمپ میں بھی وہ سب سے جُدا رہا۔

کچھ وہاں ایسے تھے جو اُس جیسے تھے۔

لیکن کچھ ایسے تھے جو نامناسب سہولتوں کے حوالے سے احتجاج کرتے رہتے تھے ۔ خوراک میں کیڑے نکالتے تھے — کمروں کا سائز اتنا چھوٹا کیوں ہے — گوشت کی کوالٹی اچھی نہیں ہے۔ کچھ ابھی تک نہیں جانتے تھے کہ وہ کس پوزیشن میں آ چکے ہیں اور اُن کا مذاق اُڑاتے تھے — کچھ نے واپسی پر کتابیں لکھنی تھیں۔

جن کے نام جنگی مجرموں کی فہرست میں آ گئے وہ دماغی توازن کی کمی بلکہ شدید کمی کا شکار ہو گئے لیکن وہ — ایک کونے میں سمٹا بیٹھا رہا۔

وہاں سے بھاگنا فرار ہونا بہت آسان تھا — پیچیدہ نہ تھا۔

ایک نیم حیوان کے لئے کچھ پیچیدہ نہ تھا۔

لیکن وہ وہاں سے نکلا تو ویسا نہ تھا جیسا تاڑ اور ناریل کے جھکے ہوئے درختوں، ہڈیوں اور سلگتی آنکھوں اور پاؤں سے اُلجھتے پانی کے سانپوں میں تھا کہ سمت کا حساب تھا، دن رات کا کوئی پیمانہ نہیں —

لیکن اب وہ جانتا تھا کہ وہ کدھر کو جا رہا ہے — اُسے اپنی سمت کا پتہ تھا۔

گھڑی دو گھڑی میں یہ کیا ماجرا ہو گیا —

ماجرا بس یہی ہوا گھڑی دو گھڑی میں کہ جب وہ گیا تھا تو اپنے وطن سے گیا تھا اب لوٹا تو یہ ملک کوئی اور تھا۔ اپنی تمامتر فراخ دلی کے باوجود وہ قبول نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اب

بنگلہ دیش ہے۔

بنگلہ دیش میں پہلے بدامنی بہت تھی اور اب اس کے ساتھ بربادی بھی بہت تھی۔ یہاں جو سالا پونزابی کے لئے گہری جان لیوا نفرت کی شدت تھی اور اب اس کے کچھ جواز اُن کے پاس تھے اور کچھ مہیا کر دیئے گئے تھے اور وہ اپنی جان کو اس خدشے میں ڈال کر اِدھر آیا تھا — اُدھر نہیں گیا تھا۔ **پاکستان کی طرف**

نصف سے زیادہ مولوی احتشام الدین کا گاؤں بھی سوختہ تھا۔ ناریل کے پیڑ جُھلسے ہوئے تھے۔ تالاب میں صرف کیچڑ تھا —

سارے کا سارا الزام ہارے ہوئے کو جاتا ہے لیکن — ہندوستان کے لئے یہ ایک فیلڈ ڈے تھا۔ وہ ایک قوم کی تاریخ سے روگردانی اور لاعلمی اور آغا جی ایسے سینکڑوں دماغوں کی وجہ سے چمپئن بن چکا تھا۔ اُن کا وزیر دفاع جگ جیون رام خود کہتا ہے کہ ہم نے ایک لاکھ تیس ہزار بنگالیوں کو پاکستانی فوج کے خلاف لڑنے کی ٹریننگ دی ہے۔ ڈاکٹر ٹریگونہ سین نے اگرتلا کے باغیوں کو باقاعدہ ایک ریڈیو ٹرانسمٹر تحفے میں دیا — سوادھن بنگلہ بیار کیندرا کا آغاز ہوتا ہے — انڈیا ہیڈ اے فیلڈ ڈے، تھینک یو آغا اینڈ ریسٹ آف دی ٹائیگرز —

تو اُس سوختہ گاؤں میں اور ناریل کے جُھلسے ہوئے پیڑوں میں بہت احتیاط برتتا مردان دبے پاؤں اُس جھونپڑے کی طرف جاتا تھا جہاں سے اُسے ناریل کے تیل کی ناگوار مہک آتی تھی لیکن وہ اُس کی جانب کھنچا چلا جاتا تھا —

جب اس نے جھونپڑے کا دروزاہ دھکیل کر اندر جھانکا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہیں پائے۔ مہرالنساء بھی اور مردان بھی...

مہرالنساء جو ایک چٹائی پر لیٹی تھی اس نے کروٹ بدل کر اُس کی جانب دیکھا اور اُس کی وحشت اور بے ترتیب داڑھی میں سے اسے الگ نہ کر سکی — تو اُس کا مہرالنساء کا پیٹ سندر بن کے چیتے کا ہموار پیٹ نہیں تھا — اس کے اندر شوبھا تھی۔ کس کی تھی؟ کسی کی بھی — ایک وار بے بی کا تعین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔

مولوی احتشام الدین کسی الشمس البدر یا کسی باہنی کے تقدس یا وطن پرستی کے کام آ چکا تھا۔ اور مہرالنساء اُس جھونپڑے میں ایک چٹائی پر لیٹی اس جنگی بچے کے باہر آنے کی

تھی... جو کسی کا بھی ہو سکتا تھا —

مہرالنساء صرف دو چار روز بعد بے حد آسائش سے شوبھا کو پیدا کر کے بے حد آسودگی سے مر گئی۔ مردان کو یہ نام پسند تھا، شوبھا!

ان دنوں کون پوچھتا تھا کہ صاحب آپ ایک نومولود بچے کو اُٹھائے کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ اسی لئے مردان سے بھی کسی نہ پوچھا — نہ ہندوستان میں دوبارہ داخل ہوتے اور نہ بہاولپور کی طرف سے پاکستان میں اندر آتے — کسی نے نہ پوچھا۔

سات کمروں والی کوٹھی دسمبر کے یخ اور گھنے اندھیرے میں تھی اور صرف ایک کھڑکی کمرے کے اندر روشن بلب کی وجہ سے اس اندھیرے سے الگ ہوتی تھی۔ وہ شوبھا کو سینے سے لگائے جٹی کھٹی کی بلند باڑ کو ایک جانور کی طرح ہی پھلانگ گیا۔ اُسے انسان کا روپ ترک کئے ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں... وہ اِس کھڑکی کے قریب ہوا یہاں تک کہ اندر کے بلب کی روشنی جو شیشوں سے گزر کر پھیکی ہو جاتی تھی اس کے چہرے پر آئی — اور کوئی دیکھتا جیسے ایسے جب وہ دانت نکوسے بھاگتا تھا جھاڑیوں میں پوشیدہ اندھیروں میں تو درندوں کی جلتی آنکھوں نے دیکھا تھا — ایسے اس کی بانس کی کھردری کونپلوں والی داڑھی میں سے اُس کی آنکھیں دہک رہی تھیں — کمرے کے اندر مشاہد نے شکاری بیگ میں کافی فلاسک کو ایک طرف کر کے کارتوسوں کا ڈبہ رکھا اور بیگ کی زِپ بند کر دی — زِپ کے چلنے کی مختصر سرسراہٹ کے بعد کمرے میں خاموشی ہو گئی لیکن اُس یکلخت خاموشی میں کچھ تھا جس نے مشاہد کو چوکنا کر دیا۔ اُس کا ہاتھ پڑی بندوق پر گیا لیکن اُس نے اسے اُٹھانے سے گریز کیا اور صرف کھڑکی کی طرف نگاہ کی — Missing Beleived Killed کی سرکاری اطلاع پر کون اعتبار کرتا ہے۔ جب تک ایک اکڑا ہوا بدن اور کھلا منہ نہ دیکھ لے کون اعتبار کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ چوکنا ہوا تو ایک شکاری کی طرح نہیں جو گھات میں ہو بلکہ ایک جانور کی طرح جس کی جانب شکاری بڑھ رہا ہو — وہ دم سادھے پڑی پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا — کیا یہ ممکن ہے کہ ہیر کو تو ایسا کوئی نہ ملا جو گئے ہوؤں کو موڑ لے آتا ہو لیکن وہ خود آ گئے ہوں۔ رانجھا جوگی بن آیا ہو اور وہ Missing Beleived Killed نہ ہو — اگر چوکھٹ پر جوگی ہے تو صدا کیوں نہیں دیتا۔ ایک دوہائی کی کُوک مشاہد کے سینے میں سے اُٹھی، پلٹی اور اُس کے اندر ہی

اندر گنبد کی صدا ہونے لگی لیکن باہر خاموشی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ رانجھا جوگی بن آیا ہو۔

باہر لاہور کے دسمبر کی یخ بستہ رات کا راج تھا اور بلب کی روشنی جو شیشوں کی رکاوٹ سے مدھم ہوتی تھی کھڑکی کے پٹ کھلنے سے باہر آئی تو وہاں جوگی کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں الاؤ جلتے تھے۔

"بھائی جان —"

Missing Beleived Killed پر کون اعتبار کرے۔

"بھائی جان میں تو حیران پریشان — جنگل بیابان"

"مردان —"

"جی بھائی جان —"

"کھڑکی کے راستے تو تم اندر نہیں آ سکتے — دروازہ تو ادھر ہے"

"میں آ سکتا ہوں بھائی جان —" اس نے اپنے ایک ہاتھ سے کوئی پارسل نما چیز تھامی اور کُود کر اندر آ گیا۔

مشاہد دم روکے کھڑا رہا — وہ کیا کرے۔ مردان کو گلے لگائے، اس کی کھُردری داڑھی میں پوشیدہ رخساروں کو چومے۔ اُس کے سر پر پیار دے کیا کرے — اور اُس نے کچھ نہ کیا۔ دم روکے کھڑا اُس کی شکل کو اپنے اندر اُتارتا رہا کہ بہت دنوں سے، نہیں برسوں سے اس کی شکل اس کی دید کا حصہ نہیں بنی تھی۔

"یہ شوبھا ہے بھائی جان —" اس نے احتیاط سے پارسل کو کھولا اور اسے کھولتے ہوئے اس کی آنکھوں کے الاؤ ٹھنڈے ہوئے اور اُن میں سرد چشمے بہنے لگے۔

وہ ایک قدم آگے آیا — آگے ہو کر بھی نیچے مردان کی گود میں نہیں دیکھا کہ اُس کی نظریں اپنے بھائی کی شکل سے ہٹتی نہ تھیں۔

"یہ میری بیٹی ہے بھائی جان —"

رُکے ہوئے وقت کے آس پاس جہاں بیرک کے تختوں میں سے بچ نکلنے والی دھوپ میں ملکی کے مزاروں پر گھیرے دار لباسوں والے سپاہی تلواریں سونتے ساکت کھڑے تھے وہاں گرینڈ فادر کلاک کی رُکی ہوئی سوئیوں کے آس پاس بچپن بھی اُسی طور

اور دم بخود کھڑے تھے جیسے اُن میں بھی سانس نہ ہو، وہ مجسمے ہوں.... شوبھا کا سراپا دھوپ جہاں کہیں بھی اس کے بدن کو روشن اور واضح کرتی تھی، زرد تھا اور مردان اس ناپسندیدہ شخص کو دیکھا جو دعویدار تھا اور وہ ایک ناراض نگاہوں والا باریش شخص

"شوبھا ــــ"

اور وہ یکدم ٹھٹکی ــــ جیسے ایک مرتبہ پھر اُسے جنگل میں ایک اور درندے نے آ

"جی بابا ــــ"

"تم کیا کہتی ہو؟"

اظہار منتظر تھا اور ایک لاپرواہ اور بغیر دکھ والے رویّے کے ساتھ سب کو دیکھتا

"کچھ نہیں بابا ــــ"

"تم کیا کہتے ہو؟" ــــ کیا نام ہے تمہارا انتظار ــــ"

"اظہار ــــ" اس نے ازحد ناگواری ظاہر کی "اور میں نے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ

رُکا ہوا وقت اور ساکت سیاہ اور بیجرز اور دھوپ کی باقی ماندہ زرد کرنیں اُسے مردان کو دیکھتے تھے کہ وہ کیا کہتا ہے اور اُس نے کہا" اگر میں یہ کہوں کہ مجھے سوچنے لئے کچھ مہلت دی جائے تو آپ کا کیا ردعمل ہو گا؟"

ایک گہرا اور اذیت سے آزاد سانس رحمان گل نے بھرا اور بقیہ بیجرز جو ایک عرصے سے ساکت اور جامد ہو چکے تھے، پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے اور اُن میں حرکت پیدا ہونے لگی۔

"بالکل سر ــــ ہم بالکل انتظار کر سکتے ہیں کیوں اظہار ــــ" داؤد نے آگے بڑھ کر ہمت کرتے ہوئے لیکن ذرا ڈرتے ڈرتے مردان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ویسے سَر آپ نے ہماری رُوحیں فنا کر دی تھیں... بالکل سَر آپ سوچ لیجئے معاملہ ہی ایسا ہے ــــ"

سب سے گہرا اور تسلی والا سانس دانش کا تھا جس کی باقاعدہ آواز تھی۔ وہ کچھ بولا صرف اُس کے چہرے پر غیر متوقع صورت حال کے خوف کی جو سلوٹیں اُبھری تھیں